اتحادی سیاست جمہوریت کیلئے موزوں

جمہوریت میں حکومت اکثریتی ووٹوں سے بنتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقلیتوں کو تعداد کے زور پر دبا دیا جائے

ابھے کمار

مین اسٹریم میڈیا کی مدد سے، نریندر مودی کی قیادت والی بی جے پی نے ہندوستان کی انتخابی تاریخ کی سب سے بڑی پروپیگنڈا مہم چلائی اور یہ دعویٰ کیا کہ حزب اختلاف الیکشن کی دوڑ میں کہیں نہیں ہے اور این ڈی اے ۲۰۲۴ء کے عام انتخابات میں ۴۰۰ سے زیادہ سیٹیں جیتنے جا رہی ہے۔ لیکن جب ۴؍جون کو نتائج کا اعلان ہوا، بی جے پی کے پروپیگنڈے کی اصلیت ظاہر ہوگئی اور اس کا تکبر ٹوٹ کر رہ گیا۔ بی جے پی کے حامیوں نے کبھی یہ خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ان کی پارٹی اکثریت سے ۳۲ سیٹیں کم پائے گی۔ اگرچہ مودی کی قیادت میں بی جے پی نے ٹی ڈی پی، جے ڈی یو اور دیگر اتحادی سیاسی جماعتوں کی حمایت سے مخلوط حکومت بنائی ہے، لیکن سچ پوچھیں تو یہ مودی کی اخلاقی شکست ہے، کیونکہ پارٹی ان کے ہی چہرے کو سامنے رکھ کر انتخابات لڑ رہی تھی۔

حالیہ انتخابی نتائج وزیر اعظم نریندر مودی کی گرتی ہوئی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس بار بی جے پی کو ۶۳ سیٹوں کا بڑا نقصان نہیں اٹھانا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرکز میں ایک بار پھر مخلوط حکومت نظر آ رہی ہے۔ پچھلے دس سالوں سے مرکزی حکومت پر ایک ہی پارٹی اور ایک ہی لیڈر کا غلبہ رہا ہے۔ تاہم، مین اسٹریم میڈیا میں حالیہ مثبت تبدیلیوں پر افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مخلوط سیاست کو معاشی اصلاحات میں رکاوٹ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

مگر بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ اتحادی سیاست اور مخلوط حکومت ہندوستان جیسے کثیر ثقافتی اور ذات پات پر مبنی معاشرے کے لیے بہتر ہیں۔ مخلوط حکومت جمہوریت کے لیے بھی مفید ہے، کیونکہ یہ کمزور اور دبے کچلے لوگوں کے حقوق کو مضبوط کرنے میں زیادہ معاون ثابت ہوتی ہے۔ مخلوط حکومت کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اقتدار میں حصہ داری کے لیے مختلف گروپوں کے لیے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مخلوط حکومت کے دوران کسی ایک جماعت یا کسی واحد شخص کی من مانی نہیں چلتی ہے۔ یعنی، مخلوط حکومت اقتدار کی مرکزیت کو روکنے کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ مخلوط حکومت جمہوریت کے اصول پر مبنی ہوئی ہے، جبکہ اکثریت کی بالادستی پر مبنی حکومت میں آمرانہ رجحانات پنپنے لگتے ہیں۔ بی جے پی اکثریتی فرقے کو مذہبی خطوط پر متحد کرنے کی کوشش کرتی آئی ہے تاکہ اسے ملک میں 'فرقہ وارانہ اکثریت' بنانے کا موقع مل جائے اور پھر وہ عرصے وقت تک اقتدار پر قابض ہو جائے۔ لیکن ایسے رجحانات مکمل طور پر جمہوری روح کے خلاف ہیں، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی تحریروں پر غور کرنا ہوگا۔

تقریباً ایک صدی قبل، جب ڈاکٹر امبیڈکر سیاست میں سرگرم تھے، انہوں نے ہندوستان کی جمہوریت کو ہندو دائیں بازو سے خطرے کا اندازہ لگایا تھا۔ ۶؍مئی ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں منعقدہ 'آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹس فیڈریشن' کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے امبیڈکر نے واضح الفاظ میں کہا تھا: 'فرقہ واریت ہمارے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، کیونکہ ہندو اصرار کرتے ہیں کہ اکثریت کی حکمرانی مقدس ہے اور اس نظام کو ہر قیمت پر برقرار رکھا جانا چاہیے'۔ اکثریت پرستی کے اصول کو جس کی ڈاکٹر امبیڈکر نے ساری زندگی مخالفت کی تھی، پچھلے دس سالوں میں بی جے پی نے اپنایا ہے۔ اسی لیے مودی حکومت کی غلط پالیسیوں پر ہونے والی کسی بھی تنقید کو ملک پر تنقید کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی گئی اور حکومت کی ناقص پالیسیوں کی مخالفت کی 'پاداش' میں بہت

> ”
>
> ہندوستان جیسے ذات پات اور طبقات کی غیر برابری پر مبنی معاشرے میں، سب کے مفادات کی حفاظت کی ذمہ داری کسی ایک طبقے کے سیاستدانوں کے ہاتھ میں نہیں دی جاسکتی۔ یہ اس لیے کہ پالیسیاں اور قوانین کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، جب تک محکوم طبقات کے لوگوں کو اقتدار میں واجب حصہ داری نہیں ملے گی اور جب تک ان کو پالیسی سازی کے عمل میں برابر کا شریک نہیں مانا جائے گا، تب تک اچھے قوانین اپنے آپ میں کمزوروں کے حقوق کو یقینی بنانے میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتے۔

سارے مسلم نوجوانوں کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ مگر امبیڈکر نے یہ بات بار بار کہی کہ جمہوریت میں حکومت اکثریتی ووٹوں سے بنتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقلیتوں کو تعداد کے زور پر دبا دیا جائے۔ اپنی بمبئی کی تقریر میں ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ 'کسی بھی کمیونٹی کو اپنی تعداد کی بنیاد پر دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کا حق نہیں ہے'۔ امبیڈکر کی یہ دلیل جمہوریت کی روح ہے۔ کمزوروں کے مسیحا نے واضح طور پر کہا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ جمہوریت کی خصوصیت میں سے ایک ہے۔ یاد رہے کہ بابا صاحب کے نزدیک اقلیتی گروپس صرف مذہبی کمیونٹیز ہی نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے تاریخی اور سماجی طور پر مظلوم اور پسماندہ کمیونٹی کو بھی اقلیت کے زمرے میں رکھا ہے۔ بابا صاحب کو اس بات کا بھی ڈر تھا کہ سماج کی اعلیٰ ذاتیں اپنے مفاد کو پورا کرنے کے لیے اسے 'قومیت' کا نام دے دیتی ہیں، جبکہ اقلیتوں کے واجب حقوق اور تحریک کو خارج کرنے کے لیے اسے 'کمیونل' قرار دے دیتی ہیں تاکہ یہ بدنام ہو جائے۔

بمبئی میں منعقدہ 'آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن' کے سالانہ اجلاس کے دو سال بعد، امبیڈکر نے ایک چھوٹا سا پمفلٹ لکھا، جسے 'اسٹیٹس اور مائنا ٹیز' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اقلیتوں کے لیے ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کتابچہ میں امبیڈکر نے کہا ہے کہ 'اقلیت کی طرف سے اقتدار میں حصہ داری کا کوئی بھی دعویٰ فرقہ پرستی کہلاتا ہے، جبکہ اکثریت کی مکمل اقتدار پر اجارہ داری کو قوم پرستی کہا جاتا ہے'۔ جس طرح سے اتحاد المسلمین کے صدر اسدالدین اویسی کی حق پر مبنی باتوں کو ہندو دائیں بازو عناصر کمیونل کہہ کر بدنام کرتے ہیں، وہ امبیڈکر کی پیشین گوئی کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ اگر ہم امبیڈکر کے خیالات کو ذہن میں رکھیں، تو ہم مخلوط سیاست کے ساتھ بھگوا جماعت اور ان کے حامی صحافیوں کی بے چینی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ جمہوری روح کے برعکس، بھگوا عناصر 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے اصول پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح بھگوا طاقتوں کو دلتوں، آدی واسیوں، او بی سی اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ اقتدار میں اشتراک کے خیال سے شدید الرجی ہے۔ وہ اس حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں کہ آمریت اور جمہوریت میں بنیادی فرق اقتدار میں حصہ داری کا سوال ہے۔ مثال کے طور پر، ایک آمرانہ حکومت اس لیے غیر جمہوری ہے کیونکہ یہ محکوم طبقات کے ساتھ اقتدار کا اشتراک کرنے سے گریز کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ایک مطلق العنان حکمراں ہر بات کا فیصلہ خود کرنا پسند کرتا ہے۔ وہ تنقید اور اختلاف سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ اس کے دور اقتدار میں اشتراکِ اقتدار کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ طاقت کے توازن کے ادارے تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ قانونی طریقہ کار پر عمل نہیں کیا جاتا۔ فیصلے مشاورت، مذاکرات اور اتفاق رائے سے نہیں ہوتے۔ صحافت اور عدلیہ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اقلیتوں کو متناسب اور موثر نمائندگی نہیں دی جاتی ہے۔ ایک اور بات جو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ ایسے رجحانات بعض اوقات جمہوری نظاموں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس، جمہوری نظام صرف انتخابات تک محدود نہیں ہوتا۔ تاہم، جمہوریت میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات بہت ضروری ہیں۔ اس طرح جمہوریت صرف حکومت سازی کا نام نہیں ہے۔ شرح نمو میں اضافہ بھی جمہوریت کی کامیابی کی علامت نہیں ہے۔ درحقیقت، کامیاب جمہوریت وہ ہے، جہاں کمزور طبقات اور پسماندہ لوگوں کے حقوق اور مفادات محفوظ ہوں اور ان کو ہر شعبہ میں برابری حاصل ہو۔ ہندوستان جیسے ذات پات اور طبقات کی غیر برابری پر مبنی معاشرے میں، سب کے مفادات کی حفاظت کی ذمہ داری کسی ایک طبقے کے سیاستدانوں کے ہاتھ میں نہیں دی جاسکتی۔ یہ اس لیے کہ پالیسیاں اور قوانین کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، جب تک محکوم طبقات کے لوگوں کو اقتدار میں واجب حصہ داری نہیں ملے گی اور جب تک ان کو پالیسی سازی کے عمل میں برابر کا شریک نہیں مانا جائے گا، تب تک اچھے قوانین اپنے آپ میں کمزوروں کے حقوق کو یقینی بنانے میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتے۔ یہ سچائی اتحادی سیاست اور مخلوط حکومت کو جمہوریت کے قریب لاتی ہے۔ ■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com